نازش فاطمہ بنگش
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی
پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال
نگرانِ مقالہ

قیصر سلیم بطور مترجم
(''ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب'' کی روشنی میں)

ABSTRACT

Qaiser Saleem as translator (In the light of the translation of "A Thousand splendid suns").
By Nazish Fatima Bangash, Research Scholar, Department of Urdu, University of Karachi.
Prof. Dr. Zafar Iqbal (Research Supervisor)

Qaiser Saleem was a fiction writer and translator who has rendered many masterpieces in to Urdu. The long list of his translations from different languages shows that he had perfected the art of translation through years of practice. Khalid Hosseini's famous novel "A Thousand splendid suns" has made ripples in literary circles. Qaiser Saleem translated that work into Urdu under the title: "Hain Zaufishan Hazar Durun Khana Aftab". The different aspects of this translation have been analysed in this article.

(۱)

ترجمہ ایک مشکل فن ہے دوسری زبانوں سے صرف الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ آج دنیا جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور علوم وفنون کے لیے جزیرے تلاش کر رہی ہے۔ ہر نیا لمحہ، نیا انکشاف لے کر ظاہر ہوتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ہر روز ایک نئے قدم کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ترقی یافتہ اقوام جس تیزی کے ساتھ ترقی اور بلندی کی منزلیں طے کر رہی ہیں اس سارے عمل نے ترقی پذیر اقوام کو ایک بڑے چیلنج کے ساتھ سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اور ایسی صورت میں یہ چیلنج زیادہ شدید تر ہوگا کہ ان ترقی پذیر اقوام کی ترقی وارتقاء کا انحصار جدید علوم وفنون سے وابستگی کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے۔ جن ممالک میں ایجادات واختراعات ہو رہی ہیں وہ ان کی اپنی قومی زبانوں میں ہیں۔ چنانچہ ان علوم کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان زبانوں پر قدرت حاصل کی جائے اور انھیں اپنی

زبان میں منتقل کیا جائے(۱)۔

کسی بھی زبان کے ادب کا تجزیہ کرنے سے اس زبان کی معاشی، معاشرتی، ذہنی اور فکری ارتقاء کا بڑی حد تک پتا چلتا ہے۔ زبانیں ایک معاشرتی قوت اور فہم وعقل کے عمیق مہاساگر، لغت و معنی اور علم و ادب، تخیلات اور اظہار و ابلاغ کے ایک خزانے کی مانند ہوتی ہیں۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح پاکستانی زبانیں بھی کسی ایک یا ایک سے زیادہ انسانوں، عالموں، ماہروں یا استادوں نے کسی شعوری کوشش سے نہیں بنائیں بلکہ یہ ایک خود کار عمل ہے اور اس طرح گویا یہ قدرت کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی ذات کے ساتھ وجود میں آتی ہیں۔ جس طرح ہر زبان روزمرہ کے ماحول کے اندر ہمیشہ مروج، جاری و ساری، مستعمل اور ہر دور میں متواتر موثر رہتی ہے اسی طرح اس میں علم و ادب بھی ہر دور میں تواتر سے پیدا ہوتا رہا ہے(۲)۔

علم و ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ ادب انسانی ذات کی تہذیب وثقافت کی علامت اور ضمانت رہا ہے اور ادب کا مقصد بھی یہی ہے۔ انسان ہمیشہ ادب سے متاثر ہوتا رہا ہے تاکہ متاثر ہونے کے بعد وہ اپنی زندگی خوب سے خوب تر گزارنے کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا چلا جائے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں شروع سے معیاری تخلیقی ادب پیدا ہوتا رہا ہے۔ معیاری اور تخلیقی ادب کے تخلیق کاروں کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا ہو۔ تاہم اگر ادیب کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا ہونے کے باوجود وہ لکھنے کی خوبیوں سے بے بہرہ ہوگا تو کامیاب ادیب نہیں بن سکے گا(۳)۔

ادیب اپنے معاشرے کے سامنے ہمیشہ جواب دہ ہوتا ہے وہ اپنے فن اور تخلیق کا وفادار ہوتا ہے اور اسے ہونا چاہیے۔ ایک ادیب یا تخلیق کار جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے یا جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کو چاہیے کہ اس کا بیان یا تذکرہ ایمانداری سے کرے اور دوسروں کے لیے حقیقت پیش کرے۔ ادیب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے وہ ایک دور کے ماحول اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک باہوش پرخلوص ادیب اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے یا کچھ محسوس کرتا ہے وہ اس کی حقیقی تصویر لفظوں کی صورت میں پیش کردیتا ہے۔ ادیب باضمیر انسان ہوتا ہے وہ ایک ذمّے دار فرد کی حیثیت میں معاشرے کے بیدار ضمیر کی مثال ہے(۴)۔

ادب میں ترجمہ ایک بہت اہم لسانی اور فکری عمل ہے اس کے باوجود کچھ تخلیق کار ادب میں ترجمے کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ سندھ کے ایک مایۂ ناز ادیب محمد ابراہیم جویو نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے:

> ''کچھ ادیب دوست یہ بھی کہتے ہیں کہ: صرف وہ ادیب دوسری زبانوں کی کتابوں کو ترجمہ کرتے رہتے ہیں جن کے پاس اپنے طور پر پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف دوسروں کی لکھی ہوئی چیزوں کو اپنی زبان میں نقل کرتے رہتے ہیں

اور خود کو ادیبوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں (۵)۔''

لیکن یہ حقیقت کے برعکس ہے۔ آج دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ہر سال ہزاروں کی تعداد میں غیر ملکی زبانوں کے ادب سے شہ پاروں کو ترجمہ کر کے مترجم اور ادیب حضرات اپنی زبان کے علمی سرمائے میں قارئین کے لیے اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری زبانوں میں نثری ادب میں عموماً اور جدید معاشرتی اور طبعی علوم میں خصوصاً معیاری کتابوں کا اگر فقدان نہیں تو کمی ضرور ہے۔ ان موضوعات پر کتابیں اتنی تعداد میں موجود نہیں ہیں جو ہمارے پڑھنے والوں کی ضروریات پوری کر سکیں۔ اس قسم کے موضوعات پر کتابیں ہماری زبان میں بھی اتنی تعداد میں ضرور موجود ہونی چاہئیں کہ وہ شخص جو صرف ہماری زبانیں ہی جانتا ہے اور غیر ملکی زبانوں میں مہارت نہیں رکھتا۔ اس کو بھی مذکورہ مواد خاطر خواہ حد تک اپنی زبانوں میں میسر ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں تراجم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

نہ صرف علمی کتابوں کا ترجمہ بلکہ ان کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبانوں میں لکھی ہوئی مشہور و مقبول ادبی کتابوں کو بھی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ہمارا ادب اور ادب کے شائقین ایسی چیزوں سے ناواقف نہ رہ جائیں (۶)۔

بیسویں صدی کے دوران میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے لے کر اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تک نے نثری ادب کا ترجمہ کیا ہے اور اقبالؔ سے لے کر فیضؔ، راشدؔ، فراقؔ، میرا جی، مجید امجد اور شان الحق حقی جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم پیش کیے ہیں۔ اُردو میں علمی اور فنی تراجم کا ذکر آتا ہے تو ذہن عام طور پر سب سے پہلے انگریزی نگارشات کے اُردو تراجم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ اُردو میں علمی تراجم کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں شروع ہوا تھا۔ گویا اُردو زبان میں ترجمہ کی تاریخ ڈیڑھ پونے دوسو برس سے زیادہ پرانی نہیں۔ لیکن اگر انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سے تراجم کو بھی شامل کر دیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اُردو میں ترجمے کا کام لگ بھگ چار سو برس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا (۷)۔

اُردو زبان میں ترجمے کا آغاز فارسی سے ہوا یہ کام سلطنت بیجاپور میں ہوا تھا جہاں حکومت، رائج الوقت فارسی کی جگہ مقامی زبان کی سرپرستی کر رہی تھی۔ اگرچہ یہ تراجم علمی یعنی سائنسی اور فنی نوعیت کے نہیں تھے اس لحاظ سے ہمارے موضوع میں شامل نہیں ہیں۔ اس زمانے اور خاص طور پر بعد کے مغلیہ دور کے مسلمانوں کی علم دوستی کے پیشِ نظر یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ شاعری کے علاوہ دیگر مضامین کی عربی اور فارسی کتب کا بھی ترجمہ ضرور ہوا ہوگا (۸)۔

جہاں تک انگریزی سے اُردو میں ترجموں کا معاملہ ہے تو اس کی تاریخ ڈیڑھ پونے دوسو برس سے زیادہ کی

نہیں۔اس سلسلے میں اداروں کے نام بھی آتے ہیں اور افراد کے بھی۔افراد میں نواب شمس الامراء اور شاہ اودھ کا نام لیا جاتا ہے اور اداروں میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج (۱۹۲۱ء تا ۱۹۰۰ء)، دارالترجمہ (۱۶۳۱ء تا ۱۸۷۷ء)، رڑکی کالج (۱۸۵۶ء تا ۱۸۸۸ء)، انجمن پنجاب (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۰ء)، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن (۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۸ء) کا نام سرِفہرست ہے(۹)۔دورِجدید میں یعنی پاکستان کے قیام کے بعد جن اداروں نے اُردو تراجم کے کام کا بیڑہ اٹھایا ان میں اُردو کالج، انجمن ترقی اُردو سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کراچی یونیورسٹی کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، پنجاب اور فیصل آباد کے تصنیف و تالیف و ترجمے کے شعبے، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی اور بہت سے اداروں کے علاوہ مقتدرہ قومی زبان بھی شامل تھے(۱۰)۔

اُردو میں علمی تصنیف و تالیف و ترجمہ کے کام کو جو مہمیز سرسید نے لگائی اس کی بدولت اُردو زبان ترقی یافتہ زبانوں کے برابر آ گئی۔سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں یہ تھا کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر ہونی چاہیے جو عمدہ کتابیں اُردو میں ترجمہ کر کے چھاپے۔ہر چند کہ یہ سوسائٹی سائنس کے لیے مخصوص نہ تھی لیکن سرسید کا میلان سائنس کی طرف زیادہ تھا(۱۱)۔

اُردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اُردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی اور گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا۔نئے طرزِ احساس کو ابھارا، پیرائیہ بیان میں صلاحیت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرائیہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔نیز یہ کہ نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔

(۲)

قیصر سلیم ۵ مئی ۱۹۲۷ء کو ضلع مونگیر بہار، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق بہار کی ملک برادری سے تھا(۱۲)۔قیصر سلیم کے بچپن کے دن صوبہ بہار (ہندوستان) اور صوبہ بلوچستان کے شہر لورالائی میں گزرے جہاں ان کے والد ملازمت کرتے تھے۔چھ برس کے تھے کہ والدہ وفات پا گئیں اور والدہ کی تدفین لورالائی ہی میں ہوئی اور والدہ کی وفات کے بعد اپنے والد کے ہمراہ واپس بہار ضلع مونگیر میں اپنے گاؤں آڑھا چلے گئے۔

اپنی ابتدائی یادوں کو کریدتے ہوئے قیصر سلیم کہتے ہیں:

> ''دادا مولوی فرخ حسین نے، جو معلم تھے اور کبھی کبھی جمعے کا خطبہ بھی دیا کرتے تھے، اور ان کے والد یعنی میرے پردادا منشی سخاوت حسین نے گاؤں میں پہلا مدرسہ قائم کیا تھا۔''

قیصر سلیم کی نثر نگاری کے زمرے میں ان کے ناول، افسانے، مضامین، تراجم، سفر نامے اور وہ مضامین یا

اقتباسات آتے ہیں جو انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کے ادب سے لیے اور شامل مطالعہ کیے ہیں۔

قیصر سلیم نے مجموعی طور پر دس کتابیں ترجمہ کی ہیں۔ وہ ادبی طور پر حد سے زیادہ متحرک اور فعال شخصیت ہیں اور ہر سال کوئی نہ کوئی تخلیق یا ترجمے کی کتاب قارئینِ ادب کی ذہنی تحریک کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پرکھتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے میں اور قارئینِ اُردو ادب کے ذوق کی تسکین کے لیے قیصر سلیم صاحب نے اپنی بہترین کوششیں صرف کی ہیں اور وہ اس کاوش میں بخوبی کامیاب رہے ہیں۔ ان کی اب تک منظر عام پر آنے والی کتبِ تراجم کی تعداد دس ہے جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ منتخب امریکی افسانے
۲۔ امریکی بیٹیاں اسلام کی راہ پر
۳۔ منتخب عالمی افسانے
۴۔ بغداد بے رحم نہیں ہے
۵۔ منتخب بنگلہ دیشی افسانے
۶۔ ہیں ضوفشاں ہزار، دروں خانہ آفتاب
۷۔ بغداد جل رہا ہے
۸۔ دوپہر یا دھوپ کے سنگ
۹۔ اندھیر نگری
۱۰۔ قصہ گینگ لینڈ ڈیموکریسی (۱۳)

قیصر سلیم ترجمے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت اصل کو بخوبی نبھایا ہے اور یہ اُن کی مہارت کا ثبوت ہے۔ کسی بھی فن پارے کو اُردو کے قالب میں ڈھالتے وقت قیصر سلیم نے یہ خیال رکھا ہے کہ وہ بوجھل اور ثقیل الفاظ سے مبرا ہوں تا کہ قاری کے ذہن میں گھر کر جائیں۔ انھوں نے مضمون کی فضا کو بدلے بغیر اس خوب صورتی سے اُسے اُردو کا لباس پہنایا ہے کہ قاری کچھ دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ وہ ایک ترجمہ پڑھ رہا ہے۔

بقول علی حیدر ملک کے:

> ''یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قیصر سلیم نے دیگر کاموں کے علاوہ مقدار اور معیار کے لحاظ سے ترجمے کا جو کام کیا ہے اسے ترجمے کی تاریخ میں

کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا یہ مترجمہ افسانے پڑھنے کے بعد آپ بھی اس کی گواہی دیں گے (۱۴)۔''

قیصر سلیم نے ترجمے کے لیے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہو۔ اس سلسلے میں قیصر سلیم کہتے ہیں:

''مترجم اگر اچھا ترجمہ کرتا ہے ایسا کہ سہل ہو۔ آسانی سے سمجھ میں آ جائے تو یقیناً ایسے مترجم کی اہمیت ہے کیوں کہ دوسری زبان کے ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنا اسی وقت مفید ہوگا جب یہ اسی طرح سمجھ میں آ جائے جس طرح اس کی اپنی زبان میں پڑھنے والے قاری کی سمجھ میں آتا ہے۔''

تخلیقی ادب کے درمیان ترجمے کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور قاری غیر ملکی ترجمہ پڑھنے میں دلچسپی کیوں رکھتے ہیں (۱۵)۔ اس کا جواب دیتے ہوئے قیصر سلیم کہتے ہیں:

''ہر انسان جس طرح دنیا دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ ملکوں ملکوں کی سیاحت کرے اور اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھے جو اس کے اپنے ملک کے اخبارات اور ٹی۔ وی اسے دکھاتے اور بتاتے ہیں ۔ اس طرح قاری بھی کتابوں کے ذریعے دیگر ممالک کے حالات و واقعات جاننے کی خواہش رکھتا ہے اور چونکہ افسانوں اور ناولوں میں انسانی زندگی بھرپور انداز میں نظر آتی ہے یہاں تک کہ ان کے احساسات اور رویّوں کا بھی علم ہوتا ہے اور یہ سب کچھ ترجموں کے ذریعے حاصل ہو جاتا ہے اس لیے قاری نہایت دلچسپی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو پڑھتا ہے بشرطیکہ ترجمہ آسان اور قابل فہم زبان میں کیا گیا ہو (۱۶)۔''

قیصر سلیم بامقصد تحریر پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ قاری کو پیغام دینا چاہتے ہیں سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے پر مائل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تحریریں محض پڑھنے لکھنے کی عادت کی ترجمانی نہیں کرتیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اپنے غور وفکر کے نتائج کو وہ سامنے لانا چاہتے ہیں۔ جو باتیں ان کے افسانوں اور ناولوں میں جگہ نہ پا سکیں۔ قیصر سلیم نے انھیں اپنے اخباری کالموں میں جگہ دے دی انھوں نے مضمون نگاری کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنے مطمح نظر کو پیش کرنے میں کسی پس وپیش یا جھجھک کا مظاہرہ نہیں کیا۔

قیصر سلیم جانتے ہیں کہ وہ ایسے واحد قلم کار نہیں ہیں جو تنہا آگ کا دریا عبور کرنے پر گامزن ہیں۔ دیگر زبانوں کے لکھنے والے بھی حالات کو جھیل رہے ہیں، حالات کے جبر کی شدت کو محسوس کر رہے ہیں اور تمام منظر نامہ واضح طور پر

سامنے آرہا ہے۔قیصر سلیم نے دیگر زبانوں سے ایسے ناولوں کا انتخاب کیا جنھیں اُردو میں منتقل کرنا ان کے مشن کا ایک لازمی جزو ٹھہرا۔ زیرِ نظر ناول "A Thousand Splendid Sun" جس کا ترجمہ قیصر سلیم نے '' ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانۂ آفتاب'' کے نام سے کیا ہے، اسی مشن کی کڑی ہے جس پر قیصر سلیم شدّ ومد سے گامزن ہیں (۱۷)۔

خالد حسینی ۱۹۶۵ء کو کابل میں پیدا ہوئے۔اُن کے والد افغان وزارت خارجہ میں ڈپلومیٹ تھے اور ان کی والدہ نے فارسی اور تاریخ کی تعلیم کابل کے ایک اسکول سے حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء کو ان کے والد کا تبادلہ پیرس کردیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کو جب ان کا خاندان واپس کابل آنے والا تھا، ان کے گھر پر سوویت کمیونسٹوں نے حملہ کیا اور یوں ان کا خاندان امریکہ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہوا۔اور ستمبر ۱۹۸۰ء کو کیلی فورنیا چلا گیا ۱۹۸۴ء کو حسینی نے گریجویشن مکمل کیا اور سینٹا کلارا یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے ۱۹۸۸ء کو بائیولوجی میں ڈگری لی۔اس کے بعد انھوں نے کیلی فورنیا یونیورسٹی سین ڈیاگو اسکول آف میڈیسن سے ۱۹۹۳ء تک مختلف ڈگریاں حاصل کیں جن میں میڈیکل کی ڈگری بھی شامل ہے۔سنہائی میڈیکل سینٹر لاس اینجلس میں انھوں نے ۲۰۰۴ء۔۱۹۹۶ء تک پریکٹس کی (۱۸)۔

مارچ ۲۰۰۱ء کو پریکٹس کے دوران حسینی نے اپنا پہلا ناول The Kite runner لکھنا شروع کیا، جسے ۲۰۰۳ء کو ریور ہیڈ بکس نے شائع کیا۔ یہ ناول ایک Best Seller ناول ثابت ہوا جو کہ تقریباً ستّر (۷۰) ممالک میں فروخت کیا گیا اور تقریباً سو (۱۰۰) ہفتے نیویارک ٹائمز میں Best Sellers کی فہرست میں جگہ پائی (۱۹)۔''

مئی ۲۰۰۷ء کو ان کے دوسرے ناول A thousand Splendid Suns نے نیویارک ٹائمز کے بہترین فروخت ہونے والے ناولوں میں اول درجہ حاصل کیا۔ درمیان کے تقریباً پندرہ ہفتوں اور تقریباً ایک پورا سال ان دو کتابوں کی تقریباً دس لاکھ کا پیاں امریکہ میں فروخت ہوئیں اور تقریباً ۳۸ لاکھ کاپیاں دنیا بھر میں فروخت ہوئیں ۲۱ رمئی ۲۰۱۳ء کو خالد حسینی کا تیسرا ناول The Mountains echoed شائع ہوا (۲۰)۔

۲۰۰۶ء کو حسینی نے (UNHCR) The United Nations Refugee Agency کے ساتھ افغانستان کا سفر کیا اور The Khalid Hussaini Foundation قائم کی (۲۱)۔

قیصر سلیم اپنے تراجم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> '' میں نے 'بغداد جل رہا ہے' کے عنوان سے اور 'بغداد بے رحم نہیں ہے' کے عنوان سے عراق کے تعلق سے اپنا فرض ادا کردیا۔ افغانستان کے لیے بھی وہی خواہش، وہی احساس کہ مظلوموں میں سے ہی کسی کی لکھی ہوئی کتاب مل جائے تو ترجمہ کرکے یہ فرض بھی ادا کردوں۔ اسی کھوج میں تھا کہ سعودی عرب جانا ہوا تو جدّہ

گیا۔ جہاں میرے بیٹے اظہر فراز کے سسرال والے قیام پذیر ہیں۔ وہاں اس
کے سالے کاشف سہیل اور ان کی شریکِ حیات ''عظمیٰ'' نے مشترکہ طور پر تعریفی
کلمات کے ساتھ جو کتاب تحفے میں دی تو میں حیران رہ گیا کہ یہ وہی کتاب ہے
جس کی مجھے تلاش تھی (۲۲)۔''

یہ ایک ناول ہے جسے'' خالد حسینی'' نے لکھا ہے جو کابل میں پیدا ہوئے اور سوویت یونین کے حملے کے بعد امریکا کے شہر کیلیفورنیا جا کر آباد ہو گئے یہ ناول'' ظاہر شاہ'' کی معزولی سے لے کے صدر'' حامد کرزئی'' تک تین نسلوں تک کی کہانی بیان کرتا ہے مصنف نے اس کا عنوان سترھویں صدی کے فارسی شاعر'' صائب تبریزی'' کی نظم کے ایک شعر سے لیا ہے۔ فارسی زبان کا اصل شعر دستیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ اس شعر کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر جوزمین ڈیوس نے ان الفاظ میں کیا ہے: One could not count the moons that shimmer on her roofs or the thousand splendid suns, that hide behind her walls میں نے کہنہ مشق بزرگ شاعر'' خواجہ منظر حسن منظر صاحب'' سے درخواست کی کہ وہ اس کا اُردو میں ترجمہ کریں تاکہ میں اس سے اس ناول کا عنوان اخذ کرسکوں۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

رخشندہ بام پر مہ و انجم کا کیا شمار
ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب

چنانچہ میں نے'' ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب'' کو مناسب سمجھ کر اس ناول کا عنوان قائم کردیا۔ ناول کے اختتام پر آپ کو حافظ کے چار مصرعے اسی حوصلہ افزاء پیغام کے ساتھ ملیں گے کہ ''غم مخور، غم مخور'' یعنی غم نہ کر غم نہ کر۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے سے پہلے اگر آپ اس عرضداشت میں متذکرہ تین کتابیں پڑھ لیں تو پورا منظر نامہ آپ کے سامنے ہوگا (۲۳)۔

(۳)

قیصر سلیم صاحب نے خالد حسینی کے ناول "A Thousand Splendid Suns" کا ترجمہ'' ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب'' کے عنوان سے کیا۔ کسی بھی لکھاری کے لیے سب سے مشکل مرحلہ ترجمہ کرنے کا ہوتا ہے اور اگر ترجمہ کسی مضمون کا ہو تو بات سنبھالنا مشکل نہیں ہوتا لیکن ناول کا ترجمہ کرنا، اور ترجمہ ایسا ہو کہ اصل کا گمان ہو تو وہاں ترجمہ نگار ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے اور پل پل اپنے ایک ایک لفظ کو کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ قیصر سلیم صاحب نے جو بھی تراجم کیے ہیں خواہ وہ بنگلہ دیشی ادب ہو، ہندوستانی ادب ہو یا انگریزی، ہمیشہ بہترین اور انعام یافتہ کتب کا انتخاب کیا

ہے "A Thousand Splendid Suns" کے مصنف خالد حسینی ایک ایسے ناول نگار ہیں جن کے ناول یہ ایوارڈ دو، دومرتبہ حاصل کر چکے ہیں اور نہ صرف ایوارڈ حاصل کیے بلکہ ان کے ناول "The Kite runner" کو فلمایا بھی گیا۔تو ایسے ناول نگار کے ناول کا ترجمہ کرنا ایک کڑاامتحان ثابت ہوسکتا تھا۔ناول بھی وہ جوکہ مغرب میں بے انتہا پسند کیا گیا ہو۔ یہ ناول صرف ناول نہیں ہے بلکہ افغانستان کی تاریخ کو قلم بند کرنے کی ایک خوب صورت کوشش ہے۔ یہ ناول اصل میں بقول مصنف ''افغان شناخت'' ہے۔

یہ وہ شناخت ہے جو ناول کے ایک کردار ''جلیل'' نے اپنی بیٹی کو ناول کی ابتدا میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ جب وہ ایک مقام پر اپنی بیٹی مریم کو اس کی ماں کے انتقال کے بعد گھر لے جاتا ہے اور دوسری اولاد اور اہل خانہ سے ملواتا ہے۔اس موقعے پر وہ مریم کے ساتھ کچھ وقت گزارتا ہے۔اور اسے افغان، فارسی، شاعری اور عظیم ثقافت کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، وہ ثقافت جو عظیم فارسی شاعری سے متعلق ہے اور پتھروں سے بنے بدھا کے عظیم مجسموں سے متعلق ہے جسے بعد میں افغانستان کے طالبان دور میں تباہ کردیا جاتا ہے۔طالبان انتہا پسند تھے اور وہ افغانستان میں اس قسم کی ثقافت کو اسلامی تعلیمات کے خلاف خیال کرتے تھے۔انھوں نے تمام فنکارانہ آزادی اظہار پر پابندی لگائی۔ پردے کو اس حد تک رائج کیا کہ تنہا گھر سے نکلنے والی خاتون کو سرعام کوڑے مارے جاتے۔شاعری، آرٹ، ادب، موسیقی پر پابندی عائد ہوئی اور ایسے قوانین لاگو کیے گئے جس کے تحت جدید افغانستانی ثقافت کو دوبارہ قبائلی قوانین کے ماتحت کردیا گیا۔ایسے قوانین جس میں مرد وعورت دونوں کے سوچنے تک پر پابندی تھی۔ ناول کے اس حصے کا ترجمہ کمال کا ہے۔ جسے قیصر سلیم نے اپنے قلم کے جادو سے اتنا خوب صورت بیان کیا ہے جو بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ ترجمہ بمطابق اصل ہے۔ذیل میں قیصر سلیم کے ترجمہ کردہ ناول سے کچھ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

(۱)

Jalil brought clippings from Herat's newspapers Ittafaq-i-Islam and read from them to her he was Mariam's link, her proof that there existed a world at large, beyond the kolba, beyond Gul Daman and Herat too, a world of Presidents with unpronunceable names, and trains and museums and soccer, and rockets that orbited the earth and landed on the moon, and, every thursday, Jalil brought a piece of that world with him to the Kolba.He was the one who told in the summer of 1973, when Mariam was fourteen, that king Zahir Shah, who had ruled from Kabul for forty years, had been overthrown in a bloodless coup. "His cousin Daoud khan did it while the king was in Italy getting

medical treatment. you remember Daoud Khan, right? I told you about him. He was Prime Minister in Kabul when you were born anyway Afghanistan is no longer a monarchy, Marian. you see, it's a republic now, and Daoud khan is the president. There are rumours anyway".Mariam asked him what a socialist was and Jalil began to explain, but Mariam barely heard him. (۲۴)

جلیل ہرات کے اخبار ''اتفاق اسلام'' کے تراشے ساتھ لاتا اور خبریں سناتا وہی مریم کے لیے رابطہ اور ثبوت تھا کہ کلبہ سے پرے ایک بڑی دنیا، گل دامن سے دور ہرات بھی موجود ہے۔ ایک وسیع دنیا اور ٹرینیں اور میوزیم اور فٹ بال اور راکٹ جو زمین کے گرد چکر لگا کر چاند پہ اُتر گئے۔ اسطرح ہر جمعرات کو جلیل دنیا کا ایک حصہ لے کر کلبہ میں آجاتا۔ وہی تھا جس نے بتایا کہ ۱۹۷۳ء کی گرمیوں میں جب مریم کی عمر چودہ برس تھی، شاہ ظاہر شاہ جس نے چالیس برس حکومت کی، اس کا تختہ بغیر خونی انقلاب کے الٹ دیا گیا ہے۔ ''اس کے کزن داؤد خان نے، جب شاہ علاج کے لیے اٹلی گیا ہوا تھا یہ قدم اٹھایا۔ داؤد خان یاد ہے؟ صحیح میں نے اس کے بارے میں تمھیں بتایا تھا۔ وہ کابل میں وزیر اعظم تھا۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ خیر افغانستان میں اب بادشاہت نہیں رہی مریم۔ یہ اب ری پبلک ہے۔ داؤد خان اس کے صدر ہیں۔ افواہ ہے کہ سوشلسٹوں نے کابل میں تمام اختیارات حاصل کرنے میں اس کی مدد کی ہے۔ یاد رکھو وہ خود سوشلسٹ نہیں ہے، لیکن انھوں نے اس کی مدد کی ہے۔ یہ افواہ ہے۔ بہرحال''۔ مریم نے پوچھا کہ سوشلسٹ کیا ہوتا ہے اور جلیل نے اسے بتانا شروع کیا لیکن مریم اسے پوری طرح سن نہ سکی (۲۵)۔

خالد حسینی کا ناول "Kite Runner" افغانستان کے مردوں کے بارے میں تھا۔ "A Thousand Splendid Suns" افغانستان کی خواتین سے متعلق ہے۔ ناول کے خاص کرداروں ''لیلی اور مریم'' کے ذریعے خالد حسینی نے افغانستانی اسلامی شدت پسند جیسے کہ مجاہدین اور طالبان کو عورتوں کے حقوق کا استحصال کرتے دکھایا۔ مثلاً یہ پردہ اور برقعہ، عورتوں کو محصور کرنا اور گھر تک محدود رکھنا اس لیے نہیں تھا کہ ان کی حفاظت ہو بلکہ اس لیے رکھا کہ انھیں کنٹرول میں رکھا جائے اور ان کی آواز دبائی جائے انھوں نے ایسے کرداروں پر زور دیا جو مضبوط خواتین کی نمائندگی کریں جیسے لیلٰی کی استانی ''خالہ رنگمال'' جو خواتین کو مضبوط دیکھنے کی حق دار ہیں یا بعض مرد کردار جیسے ''حاکم، ملّا فیض اللہ اور جمال'' ایسے کردار ہیں جنھوں نے تعلیم کو اہم جانا۔ قیصر سلیم نے دوران ترجمہ افغانستان کے ماحول اور سیاسی حالات کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر قاری خود کو اسی ماحول میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔

Mullah Faizullah listened to stories as well as he told them. when Mariam spoke, his attention never wavered. He nodded slowly and smilled with a look of gratitude, as if he

had been granted a coveted privilege. It was early to tell Mullah Faizullah that Mariam didn't dare tell Nana. One day, as they were walking, Mariam told him that she wished she would be allowed to go to school. "I mean a real school, "Akhund Sahib" like in a classroom. like my father's other kids". Mullah Faizullah stopped. the week before, Bibi Jo had brought news that Jalil's daughters Sadiah and Naheed were going to the Mehri School for girls in Herat Since then, thoughts of classrooms and teachers had rattled around Mariam's head, images of notebooks with lined pages, coloumns of numbers, and pens that made dark, heavy marks. she pictured herself in a classroom with other girls of her age. Mariam longed to place a ruler on a page and draw important looking lines. "Is that what you want?" Mullah Faizullah said, looking at her with his soft, watery eyes, his hands behind his stooping back, the shadow of his turban falling on a patch of bristling buttercups. "Yes", "And you want to me ask your mother for permission". Mariam smiled other than Jalil, she thought there was no one in the world who understood her better than her old tutor "Then what can I do? God in His wisdom, has given us each weaknesses, and fore most among my many is that I am powerless to refuse you Mariam jo, he said tapping her cheek with one arthritic finge. (۲۶)

ملا فیض اللہ کہانیاں سنتے بھی تھے۔ جب مریم بات کرتی تو وہ غور سے سنتے آہستہ آہستہ سر ہلاتے اور مسکراتے جیسے انھیں عزت دی گئی ہو۔ مریم کے لیے ایسی باتیں کہنا آسان تھا جو وہ نینا سے کہنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی۔

ایک دن جب وہ دونوں چہل قدمی کررہے تھے مریم نے ان سے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ اسے بھی اسکول میں پڑھنے دیا جائے۔

''میرا مطلب ہے اصلی اسکول اخوند صاحب کلاس روم کی طرح جیسے میرے ابو کے دوسرے بچے پڑھتے ہیں۔''

ملا فیض اللہ چلتے چلتے رُک گئے ایک ہفتہ پہلے بی بی جو نے خبر دی تھی کہ جلیل کی بیٹیاں سعدیہ اور ناہید ہرات میں لڑکیوں کے مہری اسکول جارہی ہیں۔ تب سے کلاس روم اور ٹیچروں کا تصور مریم

کے دماغ میں کھڑکھڑا رہا تھا۔نوٹ بک ،لکیروں والا کاغذ اور قلم جن سے گہری لکھائی لکھی جاتی ہے۔اس نے خود کو اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کلاس روم میں دیکھا مریم کی خواہش ہوئی کہ وہ ایک ورق پر سطر رکھ کر اچھی دکھنے والی لکیریں کھینچے۔

''کیا تم یہی کچھ چاہتی ہو؟ مُلا فیض اللہ نے کہا۔اپنی نرم اور نم آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، دونوں ہاتھ خمیدہ پیٹھ کے پیچھے کیے ہوئے۔

''ہاں''

اور تم چاہتی ہو کہ میں تمھاری ماں سے اجازت کے لیے کہوں؟''

مریم مسکرائی۔اس نے سوچا جلیل کے علاوہ دنیا میں ان بزرگ استاد کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے جو اسے سمجھتا ہو۔

تب میں کیا کرسکتا ہوں؟ اللہ نے اپنی دانش میں ہم سب کو کمزوریاں دی ہیں اور میری بہت کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں بے اختیار ہوں کہ تمھاری بات سے انکار کردوں مریم جو''

انھوں نے اپنی ایک انگلی سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔(۲۷)

ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جنگ ہمیشہ مقاصد کے حصول کے لیے برپا ہوتی ہے لیکن افغانستان میں جو جنگ طالبان کے دو دھڑوں کے درمیان شروع ہوئی اس کا مقصد صرف ایک دوسرے پر برتری اور کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ مجاہدین اور طالبان کی اس جنگ میں عام آدمی کو جو چیز سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ یہ جنگ کابل پر کنٹرول کے لیے شروع ہوئی۔ اور انھوں نے بہت کم عرصے میں اس شہر کو تباہ کر کے رکھ دیا جو کہ ان کے خیال میں ان کی فتح تھی۔اس اقتباس کے ترجمے کو قیصر سلیم نے مختصراً مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

(۳)

It was dizzying how quickly everything unrevealed. the leadership council was formed prematurely it elected Rabbani President, the other factions cried nepotism, Masood called for peace and patience. Hekmat Yar who had been excluded was incensed The Hazaras, with their long history of being oppressed and neglected seethed, insults were hurled, fingers pointed, accusations flew, meetings were angrily called off and doors slammed the city held its breaths in the mountains, loaded magazines snapped into Kalashnikaves the Mujahideen armed to the teeth but now lacking a common enemy, had found the enemy in each

other Kabul's day of reckoning had come at last and when the rockits began to rain down on Kabul, people ran for cover. (۲۸)

''ہر چیز تیزی سے سلجھائی جانے لگی لیڈر شپ کونسل قائم کر دی گئی۔ اس نے ربانی کو صدر منتخب کیا۔ دوسرے مسالک نے اقربا پروری کا شور مچایا۔ مسعود نے صبر اور امن سے کام لیا۔ حکمت یار ہو گئے جنھیں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بھڑک اٹھے۔ ہزارہ جن کی لمبی تاریخ تھی۔ ان کو دبانے اور نظر انداز کرنے کی۔ مضطرب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کی توہین کا عمل شروع ہو گیا۔ انگلیاں اٹھائی گئیں۔ الزامات لگائے گئے جلسے منسوخ ہوئے اور دروازے بند کر دیے گئے شہر نے سانس روک لیا۔ پہاڑوں میں کلاشنکوفوں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ مجاہدین جو مسلح تھے اب مشترکہ دشمن نہ ہونے کے سبب ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اور جب کابل پر راکٹ برسنے لگے تو لوگوں نے پناہ کی تلاش میں بھاگنا شروع کر دیا (۲۹)۔''

درج بالا اقتباسات اور ترجمے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قیصر سلیم صاحب نے ترجمے کے لیے ہمیشہ با مقصد تحریر کا انتخاب کیا جس سے قاری کو پیغام ملے اور غور و فکر کرنے پر مائل کرے۔ قیصر سلیم صاحب نے A Thousand Splendid Suns کے ترجمے کو بمطابق اصل کے کرنے کی خوب صورت کوشش کی ہے۔ اور شروع سے آخر تک قاری کو اپنی تحریر کے سحر میں جکڑے رکھا ہے۔

اے خیام اپنے مضمون ''ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ناول کے ترجمے کا پس منظر'' میں لکھتے ہیں:

''اس ناول کا منظر نامہ افغانستان ہے اور اس کا زمانہ تیس پینتیس سالوں پر محیط ہے۔ سوویت یونین کی جارحیت سے لے کر طالبان کی نظریاتی شدت پسندی تک اور پھر ملک کی نئے سرے سے تشکیل کی کوشش۔ اس پورے زمانے میں افغانستان کو کن کن صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ افراد کو کن المیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ سماجی زندگی کیسی تھی کئی خاندانوں کی کہانی کئی طبقوں کی کہانی، محبتیں، نفرتیں معاشی اور معاشرتی بدحالی بہت کم مسرتیں اور بہت سارے دکھ سب کچھ بہت مربوط صورت میں اس ناول میں موجود ہے (۳۰)۔''

قیصر سلیم بجا طور پر تحسین کے مستحق ہیں کہ وہ Pathos (سوز و گداز) کو اپنے ترجمے میں برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور وہی تاثر قائم کرتے ہیں جو اصل ناول میں موجود ہے۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے جو ہر کسی کے

بس کی بات نہیں قیصر سلیم نے نہ صرف بطور ناول نگار، افسانہ نگار کے اپنا لوہا منوایا ہے بلکہ بطور مترجم کے بھی انھوں نے جس نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ مغربی ادب پاروں کے تراجم کیے ہیں وہ قابل ستائش ہے اور اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ قیصر سلیم کا مطالعہ گہرا اور وسیع تھا اسی لیے ان کی ترجمہ کی ہوئی تحریروں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود ان کی تخلیق کردہ تحریریں ہیں۔

حواشی:

(۱) جمال میاں، سیّد، لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ)، مشمولہ اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۶۔۱۷

(۲) گلزار احمد، بریگیڈیر (ریٹائرڈ)، مشمولہ: اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۲۔۱۳

(۳) غلام علی الانا، ڈاکٹر، ادب میں تراجم کی اہمیت، مشمولہ: اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۲۔۲۳

(۴) ایضاً، ص ۲۴۔

(۵) ایضاً۔

(۶) ایضاً، ص ۲۵۔

(۷) طارق محمود، اُردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ، مشمولہ: اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۸۔

(۸) ایضاً۔

(۹) ایضاً، ص ۴۹۔

(۱۰) ایضاً، ص ۵۳۔

(۱۱) ایضاً، ص ۵۴۔

(۱۲) قیصر سلیم، ملک برادری کا سفر۔ مضمون مشمولہ http://qaisersaleem.com/ http://m.facebook.com

(۱۳) علی حیدر ملک، منتخب امریکی افسانے، امریکی افسانوں کے ترجمے اور قیصر سلیم (کراچی: ڈان پرنٹنگ پریس، رائٹرز بک فاؤنڈیشن، اکتوبر ۲۰۰۱ء)، ص ا۔

(۱۴) قیصر سلیم سے ایک ملاقات، انٹرویو: مرتضیٰ شریف، کتابی سلسلہ، شمارہ نمبر ۱۳، قیصر سلیم کے فن و شخصیت پر خصوصی شمارہ، (جنوری ۲۰۰۷ء)، ص

(۱۵) ایضاً۔

(۱۶) ایضاً۔

(۱۷) اے خیام، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ناول کے ترجمے کا پس منظر، مشمولہ ناول افغانستان کے تناظر میں (کراچی: طابع احمد برادرز پرنٹر، ۲۰۰۹ء)، ص ۷۔

(۱۸) www.khaled Hossaini.com. A thousand splendid suns reviews A novel summary guideline notes.

(۱۹) ایضاً۔

(۲۰) ایضاً۔

(۲۱) قیصر سلیم، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ترجمہ فلیپ کور، ناول افغانستان کے تناظر میں (کراچی: احمد برادرز پرنٹر، ۲۰۰۹ء)، ص۹۔۱۰

(۲۲) ایضاً، ص۱۰۔

(۲۳) ایضاً، ص۱۱۔

(۲۴) Khaled hossaini a thousand splendid suns (first published in great britian 2007. copy right by ATSS publication page 21-22):

(۲۵) قیصر سلیم، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب (۵ر فروری ۲۰۰۹ء)، ص۳۴۔۳۵

(۲۶) Khaled Hossaini, *A thousand splendid Suns,* 16-17

(۲۷) قیصر سلیم، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، محوّلہ بالا، ص۲۸۔۲۹

(۲۸) Khaled Hossaini, *A thousand splendid suns,* 154-155

(۲۹) قیصر سلیم، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ۲۰۰۹، ص۱۷۹۔

(۳۰) اے۔خیام، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، مضمون ناول کے ترجمے کا پس منظر، محوّلہ بالا، ص۷۔۸

مآخذ:

۱۔ احمد، گلزار، بریگیڈیر (ریٹائرڈ)، مشمولہ: اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ الانا، غلام علی، ڈاکٹر، ادب میں تراجم کی اہمیت، مشمولہ: اُردوزبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

۳۔ خیام، اے، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ناول کے ترجمے کا پس منظر، مشمولہ: ناول افغانستان کے تناظر میں، کراچی: طابع احمد برادرز پرنٹر، ۲۰۰۹ء۔

۴۔ سلیم، قیصر، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ۵ر فروری ۲۰۰۹ء۔

۵۔ ــــــــــ، ہیں ضوفشاں ہزار دروں خانہ آفتاب، ترجمہ فلیپ کور، ناول افغانستان کے تناظر میں، کراچی: احمد برادرز پرنٹر، ۲۰۰۹ء۔

۶۔ محمود، طارق، اُردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ، مشمولہ: اُردوزبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

۷۔ ملک، علی حیدر، منتخب امریکی افسانے، امریکی افسانوں کے ترجمے اور قیصر سلیم، کراچی: ڈان پرنٹنگ پریس، رائٹرز بک فاؤنڈیشن، اکتوبر ۲۰۰۱ء۔

۸۔ میاں، لیفٹیننٹ جنرل (ر)، سیّد جمال، مشمولہ اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتّبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔